مشتاق احمد یوسفی

ولادت: ۱۹۲۳ء وفات: ۲۰۱۸ء

مشتاق احمد یوسفی راجستھان کی ایک مسلم ریاست ٹونک کے ایک تعلیم یافتہ مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ یوسفی صاحب نے ابتدائی تعلیم، عربی، فارسی اور دینیات، گھر پر ہی حاصل کی۔ انھوں نے آگرہ یونیورسٹی سے بی۔اے کیا اور پھر علی گڑھ یونیورسٹی سے فلسفے میں ایم۔ اے کیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہ پاکستان آئے اور کراچی میں رہائش پذیر ہوئے۔ انھوں نے عملی زندگی کا آغاز بینکنگ سے کیا اور ساری زندگی مختلف بینکوں سے منسلک رہے اور بطور چیئرمین پاکستان بینکنگ کونسل ریٹائر ہوئے۔ آج کل کراچی میں رہائش پذیر ہیں۔

اُردو مزاح میں یوسفی صاحب کا ایک بلند مقام ہے۔ وہ ایک فطری مزاح نگار ہیں۔ علی گڑھ کے فارغ التحصیل ہونے کی وجہ سے ان کے مزاج میں ایک خاص سلیقہ اور رکھ رکھاؤ ہے۔ ہم بلا تکلف کہہ سکتے ہیں کہ ان کے مزاح کی بنیاد ایک اعلیٰ تہذیبی شعور اور مذاقِ سلیم پر استوار ہے۔ یوسفی صاحب کی تحریروں سے ان کے گہرے سماجی شعور کا پتا چلتا ہے۔ ان کی تحریریں نہ صرف مسکرانے پر مجبور کرتی ہیں، بلکہ سوچ و فکر کے لیے مواد بھی مہیا کرتی ہیں۔

یوسفی صاحب اپنے مضامین کے لیے عام زندگی کی طرف دیکھتے ہیں۔ وہ ایسے مضامین کا انتخاب کرتے ہیں، جنھیں عام طور پر افتادہ اور ناقابل توجہ سمجھا جاتا ہے، لیکن یوسفی صاحب اپنی نکتہ آفرینی کے ذریعے اسے شاہکار بنا دیتے ہیں۔ ان کی زبان سادہ اور صاف ہے۔ الفاظ کے انتخاب میں وہ بڑی احتیاط برتتے ہیں۔ دراصل یہ الفاظ کا انتخاب ہی ہے، جو مسلسل قارئین کے لبوں پر ہنسی بکھیرتا رہتا ہے۔

تصانیف: خاکم بدہن، چراغ تلے، زرگزشت، آبِ گم۔

حاجی اورنگ زیب خان

(آڑھتیانِ سوداگرانِ چوب ہائے عمارتی)

ابھی مولانا کرامت حسین کے وظیفے کو چالیس دن نہیں ہوئے تھے کہ بشارت ایک اور قضیے میں اُلجھ گئے، جو کچھ اس طرح تھا کہ حاجی اورنگ زیب خان، آڑھتیان و سوداگرانِ چوب ہائے عمارتی، پشاور ان سے رقم وصول کرنے آدھمکے۔ اُنھوں نے کوئی ایک سال قبل اعلیٰ درجے کی لکڑی پنجاب کے ایک آڑھتی کی معرفت بشارت کو سپلائی کی تھی۔ یہ داغدار نکلی۔ جب یہ سال بھر تک نہیں بکی تو بشارت نے گھاٹے سے سات ہزار میں فروخت کردی۔ بشارت کا موقف تھا کہ میں نے یہ لکڑی سات ہزار میں گھاٹے سے بیچی ہے۔ خان صاحب فرماتے تھے کہ آپ کی آدھی لکڑی تو چور لے گئے۔ آدھی پولیس والوں نے ہتھیالی۔ آپ اسے بیچنا کہتے ہیں اس کے لیے تو پشتو میں بہت بُرا لفظ ہے۔

بشارت کے تخمینے کے مطابق لکڑی کی مالیت کسی طرح سات ہزار سے زیادہ نہیں تھی۔ ادھر حاجی اورنگ زیب خاں اُصولی طور پر ایک پائی بھی چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے، جس کا مطلب یہ تھا کہ بشارت بقیہ رقم یعنی ۲۵۷۳-۹-۳[۱] روپے اپنی گرہ سے بھریں۔ (یہ رقم آج کے پندرہ ہزار روپے کے برابر تھی[۲]) خان صاحب کہتے تھے کہ آپ نے مال بیچنے میں شیطانی عجلت سے کام لیا۔ جلدی کام شیطان کا۔ ''صیب! یہ لکڑی تھی، بالغ لڑکی تو نہیں جس کی جلد از جلد رخصتی کرنا کارِ ثواب ہو۔''

ایک مدّت سے اس رقم کے بارے میں خط و کتابت ہو رہی تھی۔ ایک دن صاحب کے دل میں نہ

---

(۱) دو ہزار پانچ سو تہتر روپے نو آنے اور تین پیسے۔

(۲) یہ مضمون آج سے تقریباً پچیس سال پہلے لکھا گیا تھا۔

جانے کیا آئی کہ قانونی نوٹس کی رجسٹری کرائی اور پشاور جنرل پوسٹ آفس سے سیدھے گھر آئے۔ سامان باندھا اور نوٹس سے پہلے خود کراچی پہنچ گئے۔ نوٹس ان کی آمد کے تین دن بعد ان کی موجودگی میں اس طرح موصول ہوا کہ رجسٹری خود انھوں نے ڈاکیے کے ہاتھ سے چھین کر کھولی۔ نوٹس نکال کر پھاڑ دیا اور لفافہ بشارت کو تھمادیا۔ قیام بھی انھی کے ہاں کیا۔ اس زمانے میں دستور تھا کہ آڑھتی یا تھوک بیوپاری آئے تو اسے گھر پر ہی ٹھہرایا جاتا تھا۔ یوں بھی بشارت کی خان صاحب سے خوب بنتی تھی۔ بشارت، خان صاحب کے خلوص و مدارات کے گرویدہ اور خان صاحب ان کی لچھے دار باتوں کے دلدادہ۔

دن بھر ایک دوسرے کے ساتھ جھائیں جھائیں کرنے کے بعد، شام کو خان صاحب، بشارت کے ساتھ ان کے گھر چلے جاتے، جہاں ان کی اس طرح خاطر مدارات ہوتی جیسے دن میں کچھ ہوا ہی نہیں۔ گھر والے ان کی خاطر داریاں کرتے کرتے تنگ آچکے تھے۔ اس کے باوجود خان صاحب شاکی تھے کہ کراچی میں پتلے شوربے کا سالن کھا کھا کے میری نظر کمزور ہوگئی ہے۔ قدرے لنگڑا کر چلنے لگے تھے۔ فرماتے تھے، گھٹنوں میں شوربہ اُتر آیا ہے رات کے کھانے کے بعد سوجی کا حلوہ ضرور طلب کرتے۔ فرماتے تھے، حلوہ نہ کھاؤں تو بزرگوں کی روحیں خواب میں آ آکر ڈانٹتی ہیں۔ اکثر اُن سالم رانوں کو یاد کرکے آہیں بھرتے جو ان کے دسترخوان کی زینت ہوا کرتی تھیں۔ اُن کا پیٹ اعلیٰ نسل کے بَرّوں (دنبوں) کا قبرستان تھا، جس کے وہ مجاور تھے۔ بشارت نے دوپہر کو ان کے لیے فرنٹیر ہوٹل سے ران اور چپلی کباب منگانے شروع کیے۔ مرزا نے کئی مرتبہ کہا کہ اس سے تو بہتر ہے کہ ۳-۹-۲۵۷۳ روپے دے کر اپنا پنڈ چھڑاؤ۔ یہ پھر بھی سستا پڑے گا مگر بشارت کہتے تھے کہ سوال روپے کا نہیں، اصول کا ہے۔ خان صاحب بھی اسے اپنی انا اور اصول کا مسئلہ بنائے ہوئے تھے۔

اولیاء اللہ جس یکسوئی اور استغراق سے مراقبہ اور خدا کی عبادت کرتے ہیں۔ خان صاحب اس سے زیادہ یکسوئی اور استغراق، غذا پر صَرف کرتے تھے۔ دس سیر سُوجی بطورِ سوغات کراچی لائے تھے۔ اسی کا حلوہ بنوا بنوا کر کھا رہے تھے۔ بشارت روز سوجی کی بوری دیکھتے اور دہل جاتے اس لیے کہ ابھی تو اس کے ختم

ہونے میں بہت دیر تھی۔ خان صاحب فرماتے تھے کہ اگلی دفعہ مردان شوگر ملز سے تازہ گڑ کی بوری لاؤں گا۔ سفید چینی کھانے سے خون پتلا پڑجاتا ہے۔

خان صاحب کے اپنے دسترخوان اور خاطر مدارات کا کیا کہنا۔ بشارت کو پشاور میں ان کے ہاں مہمان رہنے کا اتفاق ہوا۔ ہر کھانے پر بکری یا دنبے کی مُسَلَّم ران سامنے رکھ دیتے۔ ناشتے اور چائے پر البتہ مرغی کی ٹانگ پر اکتفا کرتے۔ ان کے دسترخوان پر ران اور ٹانگ کے سوا کسی اور حصے کا گوشت نہیں دیکھا۔ نہ کبھی سبزی یا مچھلی دیکھی، جس کی وجہ بظاہر یہی معلوم ہوتی تھی کہ بینگن اور مچھلی کی ٹانگیں نہیں ہوتیں۔

خان صاحب وجیہہ اور بھاری بھرکم آدمی تھے۔ ان کی لغو بات میں بھی وزن محسوس ہوتا تھا۔ قد تقریباً ساڑھے چھ فٹ، جسے کلاہ اور طرے سے ساڑھے سات فٹ بنا رکھا تھا، مگر آٹھ فٹ کے لگتے تھے۔ صحت اور کاٹھی اتنی اچھی کہ عمر کچھ بھی ہوسکتی تھی۔ تن و توش کا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہتھے والی کرسی پر جیسے تیسے ٹُھنس کر بیٹھ تو جاتے، لیکن جب اٹھتے تو کرسی بھی ساتھ اُٹھتی، سنہری مونچھیں اور ہلکی براؤن آنکھیں۔ بائیں رخسار پر زخم کا ہلالی نشان، جو اگر نہ ہوتا تو چہرہ ادھورا دکھائی دیتا انگشتِ شہادت دوسری پور سے کٹی ہوئی۔

ان کی کٹی انگلی بھی ہماری ثابت انگلی سے بڑی تھی۔ پاس اور دور کی نظر خاصی کمزور تھی، لیکن عینک لگانے سے حتی الامکان احتراز کرتے۔ صرف چیک پر دستخط کرنے کے لیے پاس کی عینک لگا لیتے اور اتارنے سے پہلے جلدی جلدی اسی سے دور کی چیزیں دیکھنے کی کوشش کرتے۔ یہ معلومات ان کی دن بھر کی جغرافیائی ضروریات کے لیے کافی ہوتی تھیں۔ آنکھوں میں شوخی کی ہلکی سی تحریر۔ کُھل کر ہنستے، تو چہرہ انار دانہ ہوجاتا۔ چہرے پر ہنسی ختم ہونے کے بعد اس کی اندرونی لہروں سے پیٹ دیر تک ہچکولے کھاتا رہتا۔

واسکٹ کی جیب میں جو طلائی گھڑی رکھتے تھے، اس کی زنجیر دو فٹ لمبی ضرور ہوگی۔ اس لیے کہ واسکٹ کی ایک جیب سے دوسری جیب کا فاصلہ اتنا ہی تھا۔ جتنی دیر میں خان صاحب کی شلوار میں کمر بند ڈلتا، اتنی دیر میں آدمی حیدر آباد ہوکر آسکتا تھا۔ پُرخور تھے۔ دورانِ طعام، کلام سے پرہیز کرتے اور پانی نہیں پیتے

تھے کہ خواہ مخواہ جگہ گھیرتا ہے۔ دال کو ہندوانہ بدعت اور سبزی کھانے کو مویشیوں کی صریح حق تلفی سمجھتے تھے۔ کڑاہی گوشت کا مطلب صرف یہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ کڑاہی گوشت کھائیں گے، بلکہ کڑاہی بھر کے کھائیں گے۔ خیریت گزری کہ اس زمانے میں بالٹی گوشت کا رواج نہیں تھا، ورنہ وہ یقیناً بالٹی کو کڑاہی پر ترجیح دیتے۔ تیتر بٹیر کی ہڈیوں، انگور، مالٹے اور تربوز کے بیج تھوکنے کو زنانی نزاکتوں میں شمار کرتے تھے۔ اپنے تن و توش اور ہیئت کذائی (جسے ہیئتِ غذائی کہنا بہتر ہوگا) سے خود عاجز تھے۔ گھومنے پھرنے اور چہل قدمی کے شوقین، مگر اس شرط پر کہ ہر چالیس قدم کے بعد ستانے اور کچھ پیٹ میں ڈالنے کے لیے توقف فرمائیں گے تاکہ تازہ دم ہو کر آگے بڑھیں۔ یعنی اگلے چالیس قدم۔ مانا کہ خان صاحب میں اتنی پھرتی اور چلت پھرت نہ تھی کہ بڑھ کر دشمن پر حملہ کرسکیں، لیکن ہنگامِ قتال اگر وہ اس پر صرف گر پڑتے تو وہ پانی نہ مانگتا۔ ہاتھ پاؤں مارے بغیر وہیں دَم گھٹ کے ڈھیر ہو جاتا۔

ان کی ہنسی کی تصویر کھینچنا بہت مشکل ہے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ بڑے زور سے ایک لمبا قہقہہ لگانا چاہتے ہیں مگر بوجوہ اسے روکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے منھ سے بڑی دیر تک ایسی آوازیں نکلتی رہتیں جیسے بیٹری خلاص ہونے کے بعد کار کو بار بار اسٹارٹ کرنے سے نکلتی ہیں۔ ہنسنے سے پہلے بالعموم اپنی واسکٹ کے بٹن کھول دیتے تھے، کہتے تھے پردیس میں روز روز کس سے بٹن ٹکواؤں۔

آپ چاہیں تو خان صاحب کو ان پڑھ کہہ سکتے ہیں، مگر ان گھڑ یا جاہل ہرگز نہیں۔ رچی بسی طبیعت، بلا کی سوجھ بوجھ اور نظر رکھتے تھے، جو فوراً بات کی تہ تک پہنچ جاتی تھی۔ صحیح معنوں میں شائستۂ حیات تھے کہ انھوں نے انسان اور زندگی کو ہر رنگ میں سہا اور برتا تھا۔

خان صاحب مدرسۂ حیات کے منتہیوں اور فارغین میں سے تھے۔ خان صاحب برسوں تک، چیک پر انگوٹھا لگاتے رہے، لیکن جس دن ان کا بینک بیلنس ایک لاکھ ہوگیا، انھوں نے اردو میں دستخط کرنے سیکھ لیے۔ فرماتے تھے، انگوٹھا لگا لگا کے سود خور بینکوں سے اوور ڈرافٹ لینے میں تو کوئی ہرج نہیں، پر حلال کی

کمائی کی رقم سوچ سمجھ کر نکالنی چاہیے۔ دستخط کیا تھے، لگتا تھا کوئی لنگڑا کاکروچ دوات میں غسل کرکے کاغذ پر سے گزر گیا ہے۔ دستخط کے دوران ان کا ہاتھ ایسے توڑا مروڑی سے گزرتا اور ہر چھوٹا بڑا دائرہ بناتے وقت ان کے کھلے ہوئے منہ کی گولائی اس طرح گھٹتی بڑھتی کہ دیکھنے والے کی آنکھ میں باؤٹا آجاتا۔ اس زمانے میں خان صاحب کا اکاؤنٹ مسلم کمرشل بینک، چوک یادگار برانچ میں تھا، جہاں اردو میں دستخط کرنے والوں کو اسٹامپ کاغذ پر یہ توہین آمیز indemnity (ضمانت) دینی پڑتی تھی کہ اگر ان کے اکاؤنٹ میں جعلی دستخطوں کے سبب کوئی فراڈ ہوجائے تو بینک ذمہ دار نہ ہوگا۔ بلکہ اگر اس کے نتیجے میں بینک کو کوئی نقصان بالواسطہ یا بلاواسطہ پہنچے تو اسے بھی وہی بھریں گے۔ خان صاحب کو جب اس کا مطلب پشتو میں سمجھایا گیا تو مشتعل ہوگئے۔ اُردو بولنے والے اکاؤنٹنٹ سے کہنے لگے کہ ایسی بیہودہ شرط ماننے والے کے لیے پشتو میں بہت برا لفظ ہے۔ ہمارا دل بہت خفا ہے۔ بکتے جھکتے بینک کے انگریز منیجر کے پاس احتجاج کرنے گئے۔ کہنے لگے کہ میرے دستخط اتنے خراب ہیں کہ کوئی تعلیم یافتہ آدمی بنا ہی نہیں سکتا۔ جب میں خود اپنے دستخط اتنی مصیبت سے کرتا ہوں تو دوسرا کیسے بنا سکتا ہے؟ آپ کے اسٹاف میں دو درجن آدمی تو ہوں گے۔ سب کے سب شکل سے چور، اُچکے اور نوسرباز لگتے ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی میرے دستخط بنا کر دکھا دے، تو فوراً ایک ہزار انعام دوں گا پھر گولی سے اُڑا دوں گا مسٹر میکلین نے کہا کہ میں بینک کے قوانین نہیں بدل سکتا۔ گرنڈ لیز بینک میں بھی یہی قاعدہ ہے۔ ہم نے سارے فارم اسی سے نقل کیے ہیں۔ نقل کیا، مکھی پہ مکھی ماری ہے۔ بلکہ اس فارم پر تو پرنٹر کی لاپروائی سے نام بھی گرنڈ لیز بینک ہی کا چھپا ہے۔ خان! انگریزی میں دستخط کرنے سیکھ لو تو اس جھمیلے سے خود بخود نجات مل جائے گی۔ اپنے حکم میں التجا کا رنگ پیدا کرنے کی غرض سے اس نے خان صاحب کی چائے اور پیسٹری سے تواضع کی۔ بامتثالِ امر، خان صاحب دو مہینے تک انگریزی دستخطوں کی مشق کرتے رہے۔ جب بالکل رواں اور پختہ ہو گئے، تو چیک اُٹھا کر سیدھے مسٹر میکلین کے کمرے میں داخل ہوئے اور روبرو دستخط کرکے دکھائے۔ وہ اس طرح کہ پہلے ہاتھ اونچا کرکے چار پانچ دفعہ ہوا میں دستخط کیے اور پھر یکلخت قلم کاغذ پر رکھ کر فراٹے سے دستخط کر دیے۔ اس نے تُرنت ایک سلپ پر

اکاؤنٹنٹ کو حکم دیا کہ ان کی انڈمنٹی منسوخ تصور کی جائے۔ میں ان کے انگریزی دستخط کی، جو انھوں نے میری موجودگی میں اس کارڈ پر کیے ہیں، تصدیق کرتا ہوں۔

ہوا صرف اتنا تھا کہ خان صاحب نے ان دو مہینوں میں اپنے اردو دستخط کو دائیں سے بائیں کرنے کی بجائے بائیں سے دائیں کرنے کی مشق و مہارت بہم پہنچائی، جس کے دوران نقطے اور مرکز غائب ہوگئے۔ مسٹر میکلین کے سامنے انھوں نے یہی دستخط بائیں سے دائیں کیے اور تمام عمر اسی انگلش روش پر قائم رہے۔ چیک اور کاروباری کاغذات پر اسی طرح دستخط کرتے، لیکن اگر کسی دوست یا رشتہ دار کو خط لکھواتے یا کوئی حلف نامہ داخل کرتے، جس میں سچ بولنا ضروری ہو، تو آخر میں اردو میں دستخط کرتے۔ مطلب یہ کہ قلم دائیں سے بائیں چلتا۔ خان صاحب کو دستخط کرنے کے فن پر اب اتنی قدرت حاصل ہوگئی تھی کہ اگر جاپانی میں دستخط کرنے کے لیے کہا جاتا تو وہ اسی لیٹے ہوئے کاکروچ کو مونچھیں پکڑ کے سر کے بل کھڑا کر دیتے۔

خان صاحب کو کبھی بہ عجلت اتمامِ حجت کرنا مقصود ہوتا، یا مخالف و مخاطب کو محض بوجھوں مارنا ہوتا، تو فرماتے کہ شیخ سعدی نے فرمایا ہے کہ .... وہ اپنے تمام زرّیں و غیر زرّیں اقوال سے شیخ سعدی کے حق میں دست بردار ہوگئے تھے۔ ہمیں یقین ہے کہ شیخ سعدی اگر ان کے اقوال کو سن لیتے تو وہ خود بھی دست بردار ہوجاتے۔

بات کتنی ہی غیر متعلق اور چھوٹی سی ہو، خان صاحب اس کی پچ میں بڑے سے بڑا نقصان اُٹھانے کے لیے تیار رہتے تھے۔ درگزر اور سمجھوتے کو انھوں نے ہمیشہ شیوۂ مردانگی کے خلاف جانا۔ اکثر فرماتے کہ جو شخص خون خرابہ ہونے سے پہلے ہی سمجھوتا کر لے، اس کے لیے پشتو میں بہت بُرا لفظ ہے۔ بشارت کو ایک مرتبہ بنوں میں ان کے آبائی مکان میں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا۔ دیکھا کہ خان صاحب کسی گھمسان کے بحث مباحثے میں جیت جاتے یا کسی خوشگوار واقعے پر بہت خوش ہوتے تو فوراً باہر جا کر گھوڑے پر چڑھ جاتے اور اپنے کسی دشمن کے گھر کا چکر لگا کر واپس آجاتے۔ پھر ملازم سے اپنے سر پر ایک آفتابہ ٹھنڈے پانی کا ڈلواتے کہ غرور اللہ کو پسند نہیں۔

خان صاحب دن میں دو تین مرتبہ بشارت کو یہ دھمکی ضرور دیتے کہ ”ایک پائی بھی نہیں چھوڑوں گا۔ خواہ مجھے ایک سال تمھارے ہاں مہمان رہنا پڑے“۔ وقتاً فوقتاً یہ بھی کان میں ڈالتے رہتے کہ قبائلی آداب میزبانی کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ اگر آپ عزیز مہمان سے یہ پوچھ بیٹھیں کہ تم کب جاؤ گے اور اس پر وہ آپ کا خون نہ کردے، تو اس کی شرافت اور پختو میں شبہ ہوگا۔

صبح سے شام تک دونوں بارہ سنگھے اپنے سینگ پھنسائے پھنکاریں مارتے رہتے۔ خوش معاملگی کا واسطہ، بیوپار بیوہار کی ریت رسم، رحم کی اپیل اور ایک دوسرے کو ظلم اور دھاندلی سے باز رہنے کی وارننگ کے علاوہ کوئی اوچھا ہتھیار نہ تھا، جو اس جھگڑے میں بے دریغ استعمال نہ کیا گیا ہو۔ مثلاً خان صاحب اپنے بے پڑھے لکھے ہونے کا واسطہ دیتے۔ جواب میں بشارت خود کو دیدۂ عبرت نگاہ سے دکھواتے کہ شاعر ہوں۔ بی اے ہوں۔ فارسی پڑھی ہے اور لکڑی بیچ رہا ہوں! خان صاحب اپنی بزنس میں گھاٹے کا ذکر کرتے تو بشارت کہتے، ارے صاحب یہاں تو سرے سے بزنس ہی نہیں۔ گرہ کا کھا رہے ہیں۔ بشارت تو خیر بیوہ میم کے ساتھ اپنی فرضی مسکینی، کثیر الاولادی اور مفلوک الحالی کا ریہرسل کر چکے تھے، لیکن خان صاحب بھی بوقتِ ضرورت اپنے حال پر مگرمچھ کے آنسو بہا سکتے تھے۔ ایک دن تو ان کی ایکٹنگ اتنی مکمل تھی کہ سیدھی آنکھ سے ایک سچ مچ کا آنسو سری لنکا کے نقشے کی طرح لٹک رہا تھا۔ سائز بھی وہی۔ ایک دفعہ خان صاحب نے اپنی فرضی مظلومیت کا ترپ پھینکا کہ میرے حصے کی زمینوں پر چچا نے نصف صدی سے قبضہ کر رکھا ہے۔ بشارت نے اس کو اس طرح کاٹا کہ اپنے پیٹ کے السر پر ہاتھ رکھ کر حلفیہ کہا کہ وہ اتنی ہی مدت سے ضعفِ معدہ میں مبتلا ہیں۔ ویسے ان چونچوں میں بالعموم بشارت ہی کا پلہ بھاری رہتا، لیکن ایک دن جب خان صاحب نے نیم آبدیدہ ہو کر کہا کہ میرے تو والد بھی فوت ہو چکے ہیں، تو بشارت کو اپنے بزرگوار پر بہت غصہ آیا کہ انھیں بھی اسی وقت جینا تھا۔

لفظوں کی جنگ میں فتح کسی بھی فریق کی ہو، شہید صرف سچائی ہوتی ہے۔

خان صاحب کسی طرح رقم چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے۔ بشارت نے عاجز آکر یہاں تک کہا کہ کون صحیح ہے، کون غلط، اس کو بھول جائیے۔ یہ دیکھیے کہ آپ کا ہمارا بیوپار آئندہ بھی رہے گا۔ پھر کبھی کسر نکال لیجیے گا۔ خدانخواستہ یہ آخری سودا تو ہے نہیں۔ اس پر خان صاحب بولے: کہ خان سنگ مرجان خان نے مجھے نصیحت کی تھی کہ دوست سے ملو، تو اس طرح ملو جیسے آخری ملاقات ہے۔ اب کے بچھڑے پھر نہیں ملیں گے اور کسی سے سودا کرو، تو یہ سمجھ کے کرو کہ آخری سودا ہے۔ شیخ سعدی کہتے ہیں کہ باؤلے سے باؤلا کتا بھی یہ امید نہیں رکھ سکتا کہ جسے اس نے کاٹا ہے، وہ خود کو پھر کٹوانے کے لیے دوبارہ سہ بارہ آئے گا۔

خان صاحب اتوار کو سارے دن پلنگ پر نیم دراز ہو کر قبائلی تنازعوں اور کوہاٹ کی زمینوں کے فیصلے کرتے۔ اب وہ اورنگ زیب خاں کے بجائے پلنگ زیب خاں زیادہ معلوم ہوتے تھے۔ رات کو البتہ فرش پر سوتے۔ فرماتے تھے کہ اس سے تکبر اور کمر کا درد دور ہوتا ہے۔ ہمارے فرنٹیر میں جاڑے میں شوقین لوگ پیال (باریک خشک گھاس) پر سوتے ہیں۔ پیال سے رات بھر جنگلوں اور پہاڑوں کی خوشبو آتی رہتی ہے۔ جس آدمی کو جنگل کی خوشبو آتی اور بھاتی رہے، وہ کبھی کسی کی غلامی اور محکومی قبول نہیں کرے گا۔

نماز کے بعد کرتا اتار کر اجلاس فرماتے۔ بیشتر بنیانوں میں بڑے بڑے چھید ہو گئے تھے۔ فرماتے تھے، کیا کروں، میرے سائز کا بنیان صرف روس سے اسمگل ہو کے آتا ہے۔ کبھی کبھار لنڈی کوتل میں مل جاتا ہے، تو عیش آجاتے ہیں۔ کوئی کوئی بنیان تو اتنا خوب صورت ہوتا کہ کُرتے کے اوپر پہننے کو جی چاہتا ہے۔ خان صاحب گہرا سانس لیتے یا ہنسی کا دورہ پڑتا، تو چَوَنّی برابر سوراخ پھیل کر پنگ پانگ کی گیند کے برابر ہو جاتے۔

دوسرے مشاعرے کے بعد خان صاحب نے بڑی حیرت سے پوچھا، کیا یہاں ہر دفعہ یہی ہوتا ہے؟ جواب ملا، اور کیا! بولے: خدا کی قسم! اس چاندنی پر اتنا جھوٹ بولا گیا ہے کہ اس پر نماز جائز نہیں! ایسے جھوٹے شاعروں کی میّت کو تو حقے کے پانی سے غسل دینا چاہیے"۔

خان صاحب کے لیے شاعروں کا اتنا بڑا اجتماع ایک عجوبے سے کم نہ تھا۔ کہنے لگے، اگر قبائلی علاقے میں کسی شخص کے گھر کے سامنے ایسے مجمع لگے، تو اس کے دو سبب ہو سکتے ہیں، یا تو جرگہ بیٹھا ہے یا اس کا والد فوت ہو گیا ہے۔

کبھی کوئی شعر پسند آجائے، گو کہ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا تھا، تو "وئی!" کہہ کر فرطِ سرور سے آنکھیں بند کر لیتے اور جھومنے لگتے، شاعر وہ شعر مکرر پڑھنے لگتا، تو اسے ہاتھ کے درشت اشارے سے روک دیتے کہ اس سے ان کے لطف میں خلل واقع ہوتا ہے۔

ایک دن ایک نوجوان شاعر نے دوسرے سے باز پرس کی کہ تم نے میری زمین میں غزل کیوں کہی؟ اس نے کہا، سودا کی زمین ہے۔ تمھارے باپ کی نہیں! اس شاعر پہ یہ الزام بھی لگایا کہ وہ اضافت بہت کھاتا ہے۔ اس پر دونوں میں کافی تلخ کلامی ہوئی۔ شروع میں تو خان صاحب کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ جھگڑا کس بات کا ہے۔ اگر زرعی زمین کا تنازعہ ہے، تو زبانی کیوں لڑ رہے ہیں؟

انھیں خوشی کے عالم میں بارہا، گاتے گنگناتے بھی دیکھا۔ اپنے زمانے میں ٹنگ ٹکور کے رسیا رہ چکے تھے۔ انھیں بے شمار ٹپے یاد تھے، مگر ایک پشتو گیت ان کا فیورٹ تھا، جس کا روزِ اَبر وشبِ ماہتاب میں خون کرتے تھے۔ ان کا مکھڑا کچھ اس طرح تھا کہ دیکھ دلدارا! میں نے تیری محبت میں رقیب کو ننگی تلوار سے قتل کر ڈالا۔ کانوں پہ ہاتھ رکھ کر "یا قربان!" کے الاپ کے بعد، جس والہانہ انداز سے وہ گاتے تھے اس سے تو یہی ٹپکتا تھا کہ موصوف کو جو لذت قتل میں ملی، وصل میں اس کا عشرِ عشیر بھی نہ ملا۔

خان صاحب اپنے اہالی موالی کی معیت میں جب کچی آبادیوں اور پٹھان بستیوں کا دورہ کرتے اور راستے میں کوئی بھاری پتھر پڑا نظر آجاتا، تو کِھل اٹھتے۔ وہیں رک جاتے۔ جوانوں کو اشارہ کرتے کہ اسے اٹھا کر دکھاؤ تو جانیں۔ اگر کسی سے نہ اٹھتا، تو آستین چڑھا کر آگے بڑھتے اور سر سے اونچا اُٹھا کر دکھاتے۔ راہ چلتے لوگ اور محلے کے بچے تماشا دیکھنے کھڑے ہو جاتے۔ کبھی کراچی کی خوش حال اور صاف ستھری

بستیوں سے سواری بادِ بہاری گزرتی، تو افسوس کرتے کہ خا! یہ کیسی جھاڑو پھری خانہ خراب بستی ہے کہ ایک پتھر پڑا نظر نہیں آتا جسے کوئی مرد بچہ اٹھا سکے۔

محبت اور نفرت دونوں کا اظہار خان صاحب "ویٹ لفٹنگ" سے کرتے۔ مطلب یہ کہ بحث میں ہار جائیں، تو حریف کو اٹھا کر زمین پر پٹخ دیتے اور اگر مدت کے بچھڑے دوست مل جائیں یا ہم جیسے ناقابلِ رشک قد و قامت والے نیاز مند سلام کریں، تو معانقے کے دوران ہمیں اس طرح ہلاتے جھنجھوڑتے جیسے پھل دار درخت کی شاخ کو جھڑ جھڑاتے ہیں۔ پھر فرطِ محبت سے ہمیں زمین سے ادھر اٹھا لیتے۔ ہماری پریشانی کو اپنی Lip Level تک لاتے اور چوم کر ہوا میں نیوٹن کے سیب کی مانند گرنے کے لیے چھوڑ دیتے۔

سچ بات کہنے میں خان صاحب اتنے ہی بے بس تھے جتنے ہم آپ چھینک کے معاملے میں۔ منہ پر آئی بات اور ڈکار کو بالکل نہیں روکتے تھے۔ اگر ان کی کسی بات سے دوسرا آزردہ یا مشتعل ہو جائے تو انھیں پوری طرح اطمینان ہو جاتا تھا کہ سچ بولا ہے۔ مثلاً ایک دفعہ ایک صاحب سے ان کا تعارف کرایا گیا۔ چھوٹتے ہی پوچھنے لگے "ایسی مونچھیں رکھ کر آپ کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟" وہ صاحب بُرا مان گئے تو کہنے لگے: معاف کرنا! میں جاہل آدمی ہوں۔ یوں ہی اپنا علم بڑھانے کے لیے پوچھ لیا تھا۔

ایک طرف تو خان صاحب کی حساب فہمی کی یہ انتہا کہ ایک پائی چھوڑنے میں ان کی پختو پر حرف آتا تھا۔ دوسری طرف محبت و پاسداری کا یہ عالم کہ جہاں بشارت کا پسینا گرے وہاں ان کے دشمن کا خون بہانے کے لے تیار۔ بشارت کی دکان سے ایک ایکسائز انسپکٹر چار سال قبل دس ہزار روپے کی لکڑی ادھار لے گیا اور ہنوز رقم دبائے بیٹھا تھا۔ بشارت نے منجملہ اپنی اور پریشانیوں کے اس نقصان کا بھی ذکر کیا۔ دوسرے دن شام کو بعد مغرب، خان صاحب اپنے پچیس تیس کمانڈوز کی نفری لے کر اس کے گھر پہنچ گئے۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ انسپکٹر نے کھولا اور سببِ نزول دریافت کیا، تو خان صاحب نے کہا کہ ہم وہ کھڑکی دروازے اکھاڑ کر لے جانے کے لیے آئے ہیں، جن میں ہمارے بھائی بشارت کی لکڑی استعمال ہوئی ہے۔ یہ کہہ کر انھوں نے ایک ہی جھٹکے سے دروازے قبضے، اسکرو اور ہینڈل سمیت اکھاڑ کر اس طرح بغل میں دبا لیا، جیسے

مکتب کے بھگوڑے لڑکے تختی بغل میں دبائے پھرتے ہیں۔ دیوار پر سے انسپکٹر کے دادا مرحوم کا فوٹو جس کے بارے میں انھیں شبہ گزرا کہ اس کے فریم میں وہی لکڑی استعمال ہوئی ہے، کیل سمیت نوچ کر اپنے ایک لیفٹیننٹ کو تھما دیا۔ انسپکٹر ایک گھاگ تھا۔ موقعے کی نزاکت سمجھ گیا۔ کہنے لگا، خان صاحب! بندہ ایک معروضہ گوش گزار کرنا چاہتا ہے۔ خان صاحب بولے، زہ مڑہ۔ اب وہ کسی خرگوش کے گوش گزار کرنا۔ بھرا ہوا پیٹ فارسیاں بولتا ہے۔ ہوش میں آؤ، رقم نکالو۔

رات کے بارہ بجنے میں ابھی چار پانچ منٹ باقی تھے کہ خان صاحب نے دس ہزار کے نئے نوٹوں کی دس گڈیاں لا کر بشارت کے حوالے کر دیں۔ یہی نہیں، انھوں نے اس سے اپنے پہلوان کمانڈوز کی رکشاؤں کا کرایہ اور دودھ کے پیسے بھی بحساب ایک سیر فی کس وصول کر لیے۔

خان صاحب گھر والوں میں ایسے گھل مل گئے کہ اکثر شام کو بچوں کے لیے (جو انھیں چچا کہنے لگے تھے، مٹھائی، کپڑے اور کھلونے لے کر جاتے) سب سے چھوٹے بچے کو پیٹ پر اُچھالتے۔ پڑوس کے بچے انھیں دیکھتے ہی ان کے پیٹ کے لیے مچلنے لگتے اور ماؤں کے سر ہو جاتے۔

ایک دن صبح اٹھتے ہی خان صاحب نے اچانک یہ تجویز پیش کی کہ اب تک جو رقم آپ نے دی ہے اسے منہا کرنے کے بعد جو رقم واجب الادا بنتی ہے اس کے عوض یہ گاڑی جو عرصۂ دراز سے بیکار کھڑی ہے مجھے دیجیے۔ بشارت نے کہا، لکڑی کی اصل مالیت کسی طرح سات ہزار سے زائد نہیں، جبکہ اس گاڑی کی قیمت، مع نئی باڈی اور نئے پرزوں کے کسی طرح نو ہزار سے کم نہیں۔ خان صاحب نے جواب دیا، آپ کی گاڑی بہت سے بہت پانچ ہزار کی ہوگی، جبکہ میری لکڑی نو ہزار کی تھی۔ آپ نے تو پٹرول اور پنکچر جوڑنے کا خرچہ، خلیفہ کی تنخواہ اور اس کی زوجہ کا دین مہر بھی کار کی قیمت میں جوڑ دیا۔ بہت کچھ بحثا بحثی کے بعد واجب الادا رقم کا فرق گھٹ کر وہیں آ گیا، جہاں سے قضیہ شروع ہوا تھا۔ یعنی اب خان صاحب اس کلیم کے عوض یہ گاڑی چاہتے تھے۔

"خان صاحب آپ ۔ بزنس کر رہے ہیں یا بارٹر (barter)؟" بشارت نے جھنجلا کر پوچھا۔

"یہ کیا ہوتا ہے، صیب؟"

بشارت نے خان صاحب کی آسانی کے لئے بارٹر کا مفہوم سمجھایا۔ طول طویل تشریح سن کر بولے "یارا جی! تو پھر سیدھا سیدھا وٹہ سٹہ کیوں نہیں کہتے، جس میں ہر فریق یہی سمجھتا ہے کہ وہ گھاٹے میں رہا۔" اور یہی بھونڈی مثال برہانِ قاطع ثابت ہوئی۔ اس پر تصفیہ ہو گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو مبارک باد دی اور اس طرح گلے ملے، جس طرح وہ دکھیارے ملتے ہیں، جو ایک دوسرے کے بہنوئی بھی ہوتے ہیں اور سالے بھی۔

لیکن بشارت دل ہی دل میں خوش تھے کہ کھٹارا گاڑی سات ہزار میں بِک گئی۔ خان صاحب ان سے بھی زیادہ خوش کہ دلدّر لکڑی کے عوض نو ہزار کی کار ہتھیالی۔ دونوں فریق اس صورتِ حال کو حق کی فتح سمجھ رہے تھے، حالانکہ ہم سے دل کی بات پوچھیں، تو باطل نے باطل کو پچھاڑا تھا اور کوڑے کرکٹ کا تبادلہ کوڑے کرکٹ سے ہوا تھا۔

صبح چار بجے سے خان صاحب نے اپنا سامان باندھنا شروع کر دیا۔ فجر کی اذان کے بعد ایک اصیل مرغ کو قبلہ رو کر کے قربانی کی۔ اس کا سر، بلّی اور باقیات گھر والوں کو ناشتے میں کھلائیں۔ دل خود چاہا۔ بچے اُن کے جانے سے بہت اداس تھے۔ انھوں نے خود بھی اقرار کیا کہ میرا بھی جانے کو جی نہیں چاہتا، مگر کیا کروں، لکڑی کا کاروبار وہیں ہے۔ اگر کراچی میں جنگلات ہوتے، تو خدا کی قسم تم لوگوں کو چھوڑ کر ہرگز نہ جاتا۔ پھر انھوں نے ڈھارس بندھائی کہ ان شاءاللہ دو مہینے بعد پھر آؤں گا۔ ایک بوہری سیٹھ سے وصولی کرنی ہے، اکیلا آدمی ہوں۔ بوڑھا ہو گیا ہوں، ایک وقت میں ایک ہی بے ایمان سے نمٹ سکتا ہوں۔

بشارت کو مسکراتا دیکھ کر خود بھی مسکرا دیے۔ ارشاد فرمایا، کراچی میں اُدھار پر بزنس بیوپار کرنا ایسا ہی ہے جیسے کماد (گنے) کے کھیت میں کبڈی کھیلنا! جتنا بڑا شہر ہو گا اتنا ہی بڑا گھپلا اور پھڈا ہو گا۔ جس کی چھت زیادہ بڑی اس پر برف بھی زیادہ گرے گی۔

پھر سب سے چھوٹے بچّے کو بہلانے کے لیے چارپائی پر لیٹ گئے۔

چلتے وقت انھوں نے بشارت کی بیٹی منیزہ کو جو ان کی چہیتی ہو گئی تھی پانچ سو روپے دیے۔ یہ اس کی پانچویں سالگرہ کا تحفہ تھا، جو آٹھ دن بعد منائی جانے والی تھی۔ ۷۳-۹-۳ روپے نوکروں میں تقسیم کیے۔ اس سے قبل، گزشتہ شب وہ ایک پٹھان نوجوان گل داؤد خان کو دو ہزار روپے دے چکے تھے تاکہ وہ اپنے چچا پر، جس نے اس کی زمینوں پر قبضہ غاصبانہ کر رکھا تھا کوہاٹ جا کر فوجداری مقدمہ دائر کرے اور اس کو یتیموں کی جائیداد پر قبضہ کرنے کی ایسی سزا دلوائے کہ سب چچاؤں کو عبرت ہو۔ ان تینوں رقموں کا حاصل جمع ۲۵۷۳-۹-۳ روپے بنتا ہے اور یہی وہ رقم تھی، جس کا سارا جھگڑا تھا اور جس کی وصولی کے لیے انھوں نے اپنے کمانڈوز اور بھیرو بنگاہ سمیت لشکر کشی کی تھی۔ بلکہ بقول مرزا، غنیم کے قلعے کے قلب میں تمبو تان کر بھنگڑا ڈال رکھا تھا۔

اس قضیے کو تیس سال ہونے کو آئے۔ ہماری ساری عمر حساب کتاب میں ہی گزری ہے۔ مگر ہم آج بھی یہ نہیں بتا سکتے کہ درحقیقت کس کی کس پر کتنی رقم نکلتی تھی اور آخر میں جیت کس کی رہی۔ ہماری ہی سمجھ کا قصور تھا۔ جنھیں ہم حریف سمجھے، وہ دراصل حلیف اور دوست نکلے ______ حسابِ دوستاں دَر دِل۔

خان صاحب کے جانے کے کوئی چھ سات ہفتے بعد، ان کا املا کرایا ہوا ایک خط موصول ہوا۔ لکھا تھا کہ "بفضلِ خداوندی یہاں ہر طرح سے خیرت ہے۔ دیگر احوال یہ کہ میں نے اپنے دورانِ قیام میں آپ کو بتانا مناسب نہ سمجھا کہ ناحق آپ تردّد کرتے اور صحبت کا سارا لطف کرکرا ہو جاتا۔ پشاور سے میری روانگی سے تین ہفتے پیشتر ڈاکٹروں نے مجھے جگر کا سروسس بتایا تھا، دوسرے درجے میں، جس کا کوئی علاج نہیں۔ جناح ہسپتال والوں نے بھی یہی تشخیص کی۔ ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ ہروقت اپنا دل پشوری کرتے رہو۔ خود کو خوش رکھو اور ایسے خوش باش لوگوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارو، جن کی صحبت تمھیں بشاش رکھے۔ بس یہی تمھارا علاج اور خوگ ژوند (میٹھی زندگی) کا نسخہ ہے۔ یارا جی! میں بچہ نہیں ہوں، جو انھوں نے کہا وہ میں سمجھ گیا اور جو نہیں کہا وہ بھی بخوبی سمجھ گیا۔ یہ مشورہ تو مجھے کوئی طبلہ بجانے والا بھی مفت دے

سکتا تھا۔ اس کے لیے ایم۔آر۔سی۔پی اور ایف۔آر۔سی۔ایس ہونے اور جگہ بے جگہ ٹونٹی لگا کر دیکھنے کی ضرورت نہیں۔

"میں نے لنڈی کوتل سے لانڈھی تک نگاہ ڈالی۔ آپ سے زیادہ محبتی، خود خرسند رہنے اور دوسروں کا دل شاد کرنے والا کوئی بندہ نظر نہیں آیا۔ چنانچہ میں ٹکٹ لے کر آپ کے پاس آگیا، باقی جو کچھ ہُوا وہ طبیعت کا زنگ اُتارنے کا بہانہ تھا۔ جتنے دن آپ کے ساتھ گزرے اتنے دنوں سے میری زندگی بڑھ گئی۔ خدا آپ کو اسی طرح شادمان اور مجھ پر مہربان رکھے۔ آپ کو میری وجہ سے جو تکلیف ہوئی، اس کی معافی مانگنا لکھنوی تکلفات میں شامل ہوگا، جو مجھ جیسے جاہل کے بس کا کام نہیں۔

"اس بیماری کا خانہ خراب ہو، عمر کا پیمانہ لبریز ہونے سے پہلے ہی چھلکا جا رہا ہے۔ خط لکھوانے میں بھی سانس اکھڑ جاتی ہے۔ ڈر کے مارے ٹھیک سے کھانس بھی نہیں سکتا۔ آپ کی بھابی رونے لگتی ہے۔ مجھ سے چھپ کر وقفے وقفے سے گرج چمک کے ساتھ اشک باری کرتی ہے۔ بہتیرا سمجھاتا ہوں کہ بختاور! جب تک بالکل بے ہوش نہ ہوجاؤں، میں بیماری سے ہار ماننے والا آدمی نہیں۔ بشارت بھائی! ایسے آدمی کے لیے پشتو میں بہت برا لفظ ہے۔ گزشتہ ہفتے یونیورسٹی روڈ پر ایک نیا مکان بنوانا شروع کر دیا ہے۔ دالان میں پشاور کے پچاس یا کراچی کے سو شاعروں کے دو زانو بیٹھنے کی گنجائش ہوگی۔

باقی سب خیریت ہے۔ سب کو درجہ بدرجہ سلام، دعا، پیار اور ڈانٹ ڈپٹ"۔

بشارت پہلی ٹرین سے پشاور روانہ ہوگئے۔

(آبِ گم)

مشق

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات لکھیں۔

(الف) خان صاحب کس مقصد کے لیے کراچی آئے تھے؟

(ب) خان صاحب کی خوش خوراکی کا حال اپنے الفاظ میں لکھیں؟

(ج) بشارت نے خان صاحب کی بھیجی ہوئی لکڑی میں کیا نقائص گنوائے؟

(د) بشارت اور خان صاحب کے درمیان تنازعہ کیسے طے ہوا؟

(ہ) خان صاحب نے اپنے خط میں کیا لکھا تھا؟

(و) خان صاحب نے وٹہ سٹہ کا کیا مفہوم بتایا؟

۲۔ خالی جگہ پُر کریں۔

(الف) بشارت خان صاحب کے خلوص و مدارات کے ______ تھے۔

(ب) خان صاحب ______ اور بھاری بھرکم آدمی تھے۔

(ج) کلوروفارم سُونگھنے کو مَردوں کی ______ کے خلاف سمجھتے تھے۔

(د) اس جنگ میں فتح کسی کی بھی ہو ______ صرف سچائی ہوتی تھی۔

(ہ) وٹہ سٹہ میں ہر فریق یہی سمجھتا ہے کہ وہ ______ میں رہا۔

(و) خان صاحب نے منیزہ کو اس کی سالگرہ پر ______ کا تحفہ دیا۔

۳۔ درج ذیل جملوں کی وضاحت کریں۔

(الف) اُن کے دسترخوان پر کبھی سبزی یا مچھلی نہیں دیکھی، جس کی وجہ بظاہر یہی معلوم ہوتی ہے کہ بینگن اور